اسلام کا نظریۂ اجتماع

عقیدۂ توحید کا مقصدِ وحید

از مولانا حامد الانصاری غازی

اسلام ان تمام جدید تحریکوں اور نئے میلانات کا سرچشمہ ہے جن کا تعلق زمانۂ حال کی تمدنی گلکاری سے ہے اور جس پر ہماری دنیا کے موجودہ ترقی پسند دماغوں کو ناز ہے۔ اسلام کا اجتماعی تصور دنیا کے ان قیمتی خزانوں میں آخری اور مکمل اضافہ ہے جو زمانہ کے عقلی رجحانات اور ذہنی تصورات کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے رہے ہیں۔ اور آج پورے طور پر ہماری دسترس میں ہیں۔

اجتماعیات کے اکثر و بیشتر نظریے اس وقت دنیا کے سامنے آچکے ہیں۔ دنیا میں اس وقت کروڑوں مسلمان ہیں اور وہ ان نظریوں سے اگر کسی ایک منزل میں ایک نوعیت سے وابستہ ہیں تو کسی دوسری منزل میں اُلجھ رہے ہیں لیکن جب ایک مسلمان تمام ذہنی اور فکری الجھنوں سے آزاد ہو کر غور کرتا ہے تو اُسے سب سے پہلے اپنے مذہب کو اجتماعی مذہب ماننا پڑتا ہے۔ اور پھر عقیدہ کے درجے میں یہ اعلان کرنا پڑتا ہے۔

۱۔ اسلام انسانی وحدت کا بانی ہے، ایسی وحدت کا جو براہ راست عقیدۂ توحید سے پیدا ہوتی ہے۔

۲۔ اسلام بنی نوع انسان کی تقسیم و تفریق کے خلاف ہے اور تمام مذاہب کو ایک مذہبی

سرچشمہ پر پہنچا کر انسان کی فکری تنظیم کا فرض انجام دیتا ہے۔

۳۔ اسلام ایک برادری ہے جو ہزار قومیتوں کی جگہ ایک قومیت (عالمگیر انسانی قومیت) قائم کرتی ہے اور دنیا کی مختلف نسلوں اور طبقوں کو ایک عجیب و غریب خاندان یا مجلس اقوام کی صورت میں جمع کر دیتی ہے۔

۴۔ اسلام اجتماعیات کا ایک جامع قانون ہے اور کل بنی انسان کے لیے ہے۔ اسلام ایک عظیم جد و جہد اور ایک عظیم الشان تحریک ہے جس کا مقصد معاشی رسوم اور غلط قسم کے مذہبی رواجوں کو ختم کر کے تمام دنیا کو ایک زبردست اصلاحی اور عمرانی انقلاب کی طرف دعوت دیتا ہے۔

ایک گزشتہ شاعت میں عقیدۂ توحید سے بحث کرتے ہوئے اسلام کے متعلق جو کچھ پیش کیا گیا تھا، سطور بالا کو اُسی کا خلاصہ اور ضروری اختصار سمجھنا چاہیے

اجتماعی حجت

قرآن کا اعلان ہے کہ تکمیل دین کی تاریخ آخری صورت میں مکمل ہو چکی ہے۔ پروردگار عالم جس نعمت عظمیٰ کو عام کرنا چاہتا تھا وہ منظر عام پر آ چکی ہے۔ قرآن جو ہماری زبان میں کتاب توحید ہے اور جس کا ہر صفحہ توحید کی شاہکاری اور اُس کے نقش و نگار کی گلکاری سے آب و رنگ پائے ہوئے ہے۔ انسانی ناموس سے عام خطاب کرتا ہے۔

"تمام نسل انسانی سُن رکھے کہ حجت پوری ہو چکی ہے، دلیل اپنا کام کر چکی ہے۔ پروردگار بُرہان کو ظاہر کر چکا ہے۔ روشنی کا مینار صاف طور پر منور نظر آ رہا ہے"۔

"جو لوگ یقین کی آنکھ سے اللہ کو دیکھ رہے ہیں، اللہ پر ایمان لا چکے ہیں۔ اللہ کو پختہ طور پر اپنی زندگی کے لیے اجتماعی مرکز قرار دے چکے ہیں اُن سے رحمت خدا قریب ہے اُن کے

لیے خدا کا فضل ہے۔ اور اُن کے لیے ہدایت کی راہ ہے۔ صراطِ مستقیم کی طرف"۔

قرآنِ حکیم کے اصل الفاظ دیکھیے اور غور کیجیے کہ ایک بیش قیمت مقصد کے لیے کس قدر قیمتی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ خطاب عام ہے، مقصد خاص، اظہار و بیان کی حکمت خاص ہے، تشریح و تعبیر کا انداز عام۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا. فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا

یہاں دو باتیں واضح صورت میں موجود ہیں۔

۱۔ انسانی فطرت کے لیے جو حجتیں اور دلیلیں وحی الٰہی کی صورت میں ظاہر ہو چکی ہیں۔ ان کا مقصد ایمان باللہ یعنی اللہ کی ہستی کا یقین پیدا کرنا ہے۔

۲۔ اللہ کا یقین، محض یقین کے درجہ میں نہ ہونا چاہیے بلکہ زندگی میں صراط مستقیم اور سیدھی سچی راہ کے حصول کا حق پیدا کرنے کے لیے اس یقین کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ انسان کا ضمیر یہاں آکر ٹھہر جائے کہ اللہ کی ذات ہی زندگی کی سرگرمیوں کا مرکز محکم ہے اور وہی قابل اعتصام ہے۔ ہمیں قرآن سے جو علم حاصل ہوا ہے۔ اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اسلام ایک تخلیقی اصل ہے یعنی اسلام موجود ہے اور آغاز تخلیق سے ہے وہ آغاز میں جو کچھ تھا آج تکمیل دین اور تشریح احکام کے اعتبار سے کچھ اس سے بھی زیادہ ہے، مگر مختلف نہیں ہے۔

مومنین و منکرین

یہ بات ہمارے لیے قابل غور ضرور ہے لیکن ہمیں اپنی راہ سے جُدا نہیں کر سکتی کہ دنیا کی آبادی کا ایک حصہ اس وقت تک اس منزل پر نہیں پہنچ سکا جہاں ہم تیرہ سو سال سے ہیں اور

جہاں انسانیت کا حقیقت رس دماغ انسان کی پیدائش کے وقت سے پہنچا ہوا ہے۔ ایک سچے مسلمان کے ضمیر کے اطمینان کے لیے پہلے اور آخری درجے میں یہ کافی ہے کہ وہ دنیا میں ایک کارفرما قوت کو موحدانہ رنگ میں تسلیم کرتا رہے اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کے لیے کام کرنے پر آمادہ رہے۔ اگر منکر طبع اور کافر دل انسانوں کا کوئی طبقہ اپنی فطرت کے جوہر عالی کو بلند پروازی کے دائرۂ عالی سے پستی او گراوٹ کی نشیبی منزل کی طرف لیجانا چاہتا ہے تو اس کے متعلق توحید ہی کے قانون کی زبان میں کہا جائیگا۔

۱۔ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ جوشخص سیدھی راہ اور سچی رہنمائی کو قبول کرتا ہے تو وہ اپنے نفس کی بھلائی اور بہتری کے لیے قبول کرتا ہے۔

۲۔ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ۔ اور جوشخص ہدایت اور روشنی کے مینار کو دیکھنے کے باوجود اپنے جہاز کو کفر و انکار کی چٹان سے ٹکرانا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ راہِ مستقیم سے ہٹ کر ایک گمراہ انسان کی جگہ لیتا ہے۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا فخر یہ ہے کہ ہم موحد ہیں اور توحید ہمارے سینوں کی امانت ہے، ہم اسلام کی سرگرمیوں میں جس شئے کو سب رس اور ہمہ گیر پاتے ہیں اس کا اجتماعی رجحان بناوٹ کے ساتھ نہیں بلکہ حقیقی طور پر تمام دنیا کی وحدت کی طرف ہے۔ دنیا توحید کی اس اصل کو آج نہ سہی کل ماننے پر مجبور ہوگی۔ انکار کرنے والی قوتیں اپنے مخالف احساس کی بنیاد پر اس رجحان کو مسلمان کے دل کا چور سمجھ سکتی ہیں لیکن مسلمانوں کی اُمیدوں اور ارادوں کے سمندر میں جو طوفان نظر آتا ہے اُس کی مثال اُس جوار بھاٹے کی طرح ہے جس نے موسم کی شدید مزاحمتوں ہوا کے مخالف طوفانوں، آج اور کل کے اُتار چڑھاؤ کے باوجود اپنے سینے کے سچے موتی کو اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ایک مسلمان ایک سچا مسلمان یہ چاہتا ہے اور بغیر شک وشبہ یہ چاہتا ہے

کہ تمام دنیا ایک مذہبی نصب العین پر جمع ہو جائے۔

مسلمان کی نظر میں توحید ایک صداقت ہے اور وہ اپنی جگہ اس صداقت پر مطمئن ہے سچائی کو سچائی ماننے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم دنیا کی نظر کے آسمان پر ان ستاروں کو دیکھیں جو ہوا اور فضا کی موجودگی کے باوجود کم رو ہیں اور کجروی کو اپنے لیے کافی سمجھتے ہیں اگر ہم اپنی آنکھوں سے ہدایت کے پردہ پر روشنی کو دیکھ رہے ہیں اور ہمیں اس روشنی میں حقیقت کا چہرہ صاف نظر آرہا ہے تو ہم دنیا کے سامنے آنے اور اگر حق کا پیغام دینے کے لیے کسی نئے معجزے کا انتظار نہیں کرینگے بلکہ جب ہمیں موقع ملیگا تو ہم اپنے دل کے نوشتوں کو صاف زبان میں دنیا کے سامنے پیش کرینگے اور اپنے عمل سے یہ ثابت کر دینگے کہ توحید کا عقیدۂ عظیم دنیا کے جسم میں روح کی طرح کارفرمائی کا حق رکھتا ہے اور دنیا کی ابتدا سے اس وقت تک خدا کے نیک نہاد پیغمبروں کی معرفت اہل دنیا کے قلوب میں جگہ حاصل کرتا رہا ہے۔

نسل انسانی اور توحید۔

حضرتِ آدمؑ کے عہد سے ظہور قدسی تک ہر زمانہ میں انبیاء آتے رہے اور برابر توحید کا پیغام دیتے رہے۔ قرآن اسی سلسلہ میں عوام کے دو طبقوں کا ذکر کرتا ہے۔ فَمِنْهُمْ مَنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ (ان میں سے ایک جماعت میں وہ لوگ ہیں جو ایمان پر قائم رہے اور دوسری جماعت میں وہ افراد جنہوں نے کفر اور انکار کو اختیار کیا)

قرآنِ حکیم کی، ابتدا ہی میں نسلِ آدم کو توحید کی طرف عام دعوت دی گئی ہے اس دعوت میں عالمِ خلق کا ذکر ہے، انسانی پیدائش کا تذکرہ ہے۔ زمین و آسمان کے ایک نظام کو حجت کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور آخر میں بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ ایک جملہ میں شرک کو اس طرح محدود کر دیا ہے کہ انسان پر ہر طرف سے شرک کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

قرآن علم و تحقیق کا کتنا اچھا اسلوب اختیار کر کے کہتا ہے :-

"اے افرادِ نسلِ انسانی! اپنے پروردگار کی عبادت کرو، اُس کو پرستش کا مقصد و منشاء تصور کرو دیکھو وہی ہے جس نے تم کو اور تم سے پہلے انسانی افراد کو پیدا کیا - کاش تم اس حقیقت کو سمجھ سکو کہ تمہاری پیدائش کا مقصد خدا ترسی تقوٰی اور نکو کاری ہے وہ بے خبر ہستی کی ذات ہے جس نے زمین کو فرش بنا کر بچھا دیا ہے اور آسمان کو چھت بنا کر بلند کر دیا ہے -

پھر یہ تو دیکھو اُس نے پانی برسا کر تم کو کتنا فائدہ پہنچایا تمہارے لیے پھول اور پھل پیدا کیے اور اُنہیں تمہارے کھانے کی چیز بنایا - یہ سب اس لیے تاکہ تم اللہ کے مقام اتقیا کو علم و بصیرت کی نظر سے دیکھو اور کسی دوسرے کو اس کا شریک اور اس کا ہمسر و ہمپایہ نہ بناؤ کیونکہ تم خود حقیقتِ توحید کا علم رکھتے ہو!

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ

شرفِ توحید اور جرمِ شرک

قرآن نے بار بار اس امر کو ظاہر کیا ہے کہ ہماری دنیا کا ایک نظام ہے اور اس نظام کا مرکزی نقطہ توحید کا اقرار اور شرک سے انکار ہے جس طرح مذکورہ آیت میں آخری طور پر فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا پر زور دے کر یہ نکتہ پیش کیا گیا ہے کہ اللہ کا کوئی ہمسر نہیں اسی طرح قرآن میں بہ شانِ عمومیت یہ تعلیم بھی موجود ہے :-

(۱) وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا - اللہ کی پرستش کرو اور اُس کے لیے ادنیٰ درجہ میں بھی

شرک کو روا نہ رکھو۔

(۲) اِنِّیْ اُمِرْتُ اَنْ اَکُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ میں مامور ہوں کہ یہ کہوں کہ میں اولین مسلمان ہوں، تو مشرکین میں داخل نہ ہو (الانعام)

(۳) اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں کرسکتا۔ شرک کے علاوہ دوسرے گناہوں کو معاف کردیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔

(۴) وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا۔ جو شخص توحید کے عقیدہ سے علیحدہ ہوکر شرک کا ارتکاب کرتا ہے وہ گمراہی کی بعید ترین راہ پر پہنچ جاتا ہے۔

(۵) اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (اس میں کوئی شک نہیں کہ شرک دنیائے انسانیت کے لیے ایک بڑی زیادتی ہے۔

(۶) وَالْکٰفِرُوْنَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ اور کافر ہی ظالم ہیں۔

(۷) مَنْ یَّتَبَدَّلِ الْکُفْرَ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ، جو شخص ایمان کو کفر سے بدل ڈالتا ہے، لاریب راہ راست سے گمراہ ہوجاتا ہے۔

قرآن حکیم کا مقصد یہ ہے کہ شرک اختیار نہ کرو، مشرکوں میں داخل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں کریگا۔ شرک زبردست گمراہی ہے، شرک بڑی زیادتی ہے۔ توحید کے منکر کافر ہیں اور کافر ظالم ہیں۔ جو شخص ایمان کو کفر سے بدل ڈالتا ہے وہ سیدھی راہ کو چھوڑ کر غلط راہ اختیار کرتا ہے۔ قرآن حکیم توحید پر جس قدر بھی زور دیتا ہے اُس کی اجتماعی اصل یہ ہے کہ دنیا جب توحید کو اختیار کرلیتی ہے تو انسانی وحدت ضرور بروئے کار آتی ہے۔ انسانی ناموس زندہ ہوجاتا ہے۔ انسان کا شرف و مجد بڑھ جاتا ہے عام خیالات میں ہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہے۔ نظر میں بلندی اور مساوات ظاہر ہوتی ہے۔ روح ایک بلند و برتر ذات کے علاوہ کسی کے سامنے

ہیں جھکتی۔ اس کے برعکس پوری قوت اور صحت کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ انسانی زندگی تاریخ کے جس زمانے میں بھی توحید کے مرکز اجتماعی سے علیحدہ ہو کر شرک میں مبتلا ہوتی ہے اسی زمانہ میں زندگی کا شیرازہ اجتماعی درہم برہم ہوجاتا ہے۔ زندگی اپنے تمام مظاہر خارجی میں ایک قسم کا انحطاط محسوس کرتی ہے، اتحاد اور امن باطل ہوجاتا ہے، مذہب کو زوال شروع ہوجاتا ہے اور سلطنت کے نظام میں رخنے پڑنے شروع ہوجاتے ہیں۔ یہ ایک کلیہ ہے کہ توحید کا زمانہ زندگی کی تنظیم و توحید کا دور ہوتا ہے اور شرک کے دور میں زندگی کے اجزا متفرق اور منتشر ہوکر انسان کی بدبختی اور پستی کو نمایاں کردیتے ہیں۔

قرآن شرک کو ظلم عظیم قرار دیتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ شرک ناقابل معافی جرم ہے اسلامی اجتماعیات کے امام اور عصر حاضر کے مشہور شارح قرآن علامہ سید رشید رضا مرحوم قرآن کے اس اعلان کے حق میں دلیل پیش کرتے ہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ الشرك فی نفسه هو منتهی فساد الارواح وسفاهة الانفس[1] یہ اس لیے کہ شرک فی نفسہ روح کے فساد اور نفس انسانی کی انتہائی پستی کو ظاہر کرتا ہے۔

جب ہم توحید کا لفظ بولتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ دنیا اور اس دنیا کی ہر شئے انسان کے لیے ہے اور انسان ایک خدا کے لیے ہے۔ انسان اشرف ہے اور دنیا کی ہر شئے سے اشرف ہے مگر شرک انسان کے درجے کو گرا دیتا ہے اور اس کی جبین شرف کو حقیر تراشیدہ کے سامنے جھکنے پر مجبور کردیتا ہے جب انسان کی روح کسی جامد پتھر، انسان کے ہاتھ کے بنائے ہوئے اور گھڑے ہوئے خدا، آسمان کے عناصر اور زمین کی پستیوں کے معبودانِ باطل کے سامنے جھکتی ہے تو اس کو شرک کا نام دیا جاتا ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان اپنے مقام شرف سے گر کر اپنی جمعیت کے حقیقی مرکز کو ضائع کررہا ہے۔

[1] تفسیر المنار ۳۶

انسانی فطرت اور انسانی وحدت

اسلام توحید سے انسانی وحدت کو پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسلامی وحدت کا یہ اسلامی تصور جس اجتماعی شعور پر مبنی ہے ہم اس کو انسانی فطرت کے مغائر نہیں کہہ سکتے کیونکہ اسلام سب سے پہلے نفس انسانی اور انسانی فطرت کو تسلیم کرتا ہے، خدا نے انسانی فطرت کو بنایا ہے۔ اُس کو اختیار دیا گیا ہے اور یہ استعداد عطا کی گئی ہے کہ خدا کے قانون کے مطابق چلے۔

قرآن حکیم میں تصریح ہے:۔

(۱) فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ۔ (روم)

وہ اللہ کی فطرت ہے جس فطرت پر انسانوں کو پیدا کیا گیا ہے، خدا کا قانون فطرت انقلاب و تغیر سے بدل نہیں سکتا فطرت کا یہی مطمح نظر ایک مستقل اور محکم مذہب ہے۔

قرآن اسی نکتہ کو ایک اور عنوان سے سمجھاتا ہے اور توحید کے کلمہ کو بلند کرتا ہے۔

وَمَا لِیَ لَا اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ (یٰسٓ)

ایک انسان شرک سے علٰحدہ ہو کر بول اٹھتا ہے میں اتنا پست تو نہیں ہوں کہ میں اس معبود کو نظر انداز کر دوں جس نے مجھ کو فطرت خلق پر پیدا کیا ہے۔

صحیح بخاری جو کتاب اللہ کے بعد دنیا کی صحیح ترین کتاب ہے، دوسرے الفاظ میں انسانی فطرت پر گواہی دیتی ہے۔

عن ابی ھریرۃ ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ ابو ہریرہ روایت فرماتے ہیں کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔

اسلام میں انسانی فطرت کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ قرآن خود اسلام کو دین فطرت قرار دیتا ہے۔ قرآن کی تعلیم کی رو سے دین فطرت تمام انبیاء کا دین ہے۔ چونکہ ہر رسول توحید کا پیامبر رہا ہے۔ اس لیے آغاز تحقیق سے آج تک انسانی تنظیم کا تصور اسلام کے ساتھ رہا ہے۔ احکام الٰہی کا جو

مجموعۂ قوانین محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ضابطہ پیغمبری رہا ہے وہی حضرت نوحؑ حضرت ابراہیم حضرت موسیٰ اور دوسرے انبیاء کے لیے اصول قرار دیا جا چکا ہے جس طرح نبی آخر الزماں کو توحید کا حکم ملا ہے اسی طرح ماضی میں اقوام و ملل کو توحید کی تعلیم دیگئی ہے اور تفریق سے احتراز کرنے کی ہدایت کی گئی۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا۔

تمہارے لیے بھی مذہب کا وہی قانون ہے جو نوح کے لیے تھا اور جو تمہارے لیے قانون قرار دیا گیا ہے۔ یہی قانون ابراہیم اور موسیٰ کو دیا گیا تھا۔ تم مامور ہو قیام دین کے فرض کو پورا کرو اور (فطرت سے علیحدہ ہو کر) منتشر اور آپس میں منقسم نہ ہو۔

انسان کا نظریۂ اجتماع

قرآن حکیم انسانی فطرت کو درجہ امتیاز عطا کر کے توحید و تنظیم کا جو اصول پیش کرتا ہے اس میں عالمگیر اجتماعی اصول بننے کے لیے پوری پوری لچک ہے۔ انسانی وحدت کا تصور اسلام کے علاوہ دوسری شکلوں میں دنیا پر حاوی رہا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ دوسرے نظریے عموماً عقل کی خامکاری کی وجہ سے اصل مرکز تک نہیں پہنچتے اور اسلام نے اپنے اجتماعی نظریہ کو ان تمام الجھنوں سے آزاد کر دیا ہے جنہوں نے انسان کو غیر طبعی معتقدات میں گرفتار کر رکھا تھا۔

مشہور جرمن مقنن جے کے بلنچلی عام نظریۂ اجتماع سے بحث کرتا ہے۔

"اعلیٰ مذہبی احساس کے لیے بنی نوع انسان کی وحدت پر ایمان لانا ضروری ہے مہذب سلطنتیں نوع انسان کی اجتماعی یکجہتی کو مانتی ہیں اور یہ تسلیم کرتی ہیں کہ پست درجے کی نسلوں اور قبیلوں تک میں انسانی فطرت موجود ہے"[1]

ژان ژاک روسو جس کو انقلاب فرانس کا روحانی باپ کہا جاتا ہے اور جس کے فلسفہ کو

---

[1] نظریہ سلطنت جے کے بلنچلی صفحہ ۸۱

انقلاب وتجدد کے اس دور میں خاص اہمیت حاصل ہے انسانی وحدت کو ایک تخلیقی ضرورت قرار دیتا ہے۔ روسو کہتا ہے :-

"انسان کے لیے اب نئی قوتوں کی تخلیق ممکن نہیں بلکہ اس کے پاس جو قوتیں ہیں وہ انہیں ہی اجتماعی صورت دیکر کام میں لاسکتا ہے"[1]

انگلستان کا مشہور شارح قانون لارڈ برائس اپنی کتاب موڈرن ڈیماکریسی[2] میں انسانی جمعیت کے تصور کے ارتقا کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کی ارتقائی حالت کو تدریجی قرار دیتا ہے۔ لارڈ برائس کی تصریح ہے کہ انسانی جمعیت کی تخلیق اس طرح ہوئی کہ

"جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا آبادیاں بڑھتی گئیں چھوٹی چھوٹی بستیاں آپس میں متحد ہوتی گئیں، رفتہ رفتہ بڑے بڑے فرقے اور فرقوں سے قومیں بنیں انسان کی یہ اجتماعی تنظیم اس وقت رونما ہوئی جب انسان وحشیانہ زندگی سے منظم طریقۂ تمدن کی طرف ترقی کر رہا تھا"

بلنچلی، روسو، برائس اس نظریۂ اجتماع کے وکیل ہیں جو انسان کے دماغ کی پیداوار ہے انہوں نے اجتماعیات پر جو رائیں پیش کی ہیں ان کا تعلق صرف آج سے نہیں ہے بلکہ وہ دور ماضی کی بھی اسی طرح شرح پیش کرتی ہیں جس طرح آج کے نظریۂ تنظیم کی لیکن اسلام اسی اجتماعی تصور کو ایک فطری عقیدہ کی بنیاد پر فطری مذہب بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔

لارڈ برائس کا قلم آبادیوں سے بڑی بستیوں تک اور فرقوں سے قوموں تک پہنچ کر رک جاتا ہے لیکن اسلام آگے قدم اٹھاتا ہے وہ بڑی بڑی بستیوں سے ایک مکمل عمرانی دنیا تیار کرتا ہے اور بڑی بڑی قوموں کو توحید کی حاکمیت کے ماتحت ایک بڑی قوم کی صورت دینا

---

[1] معاہدۂ عمرانی (روسو) [2] دیکھو فصل ۱۲۔

چاہتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام ایک ایسی تنظیم کو منظور کرتا ہے جس کا رجحان پہلے ہی لمحہ میں خدا کی طرف ہو سکے، دوسرے نظریے اس خوبی سے خالی ہیں۔ روسو ایک مرحلہ پر اپنے نظریہ کی خامی کو محسوس کرتا ہے اور کہتا ہے :-

"انسان کی تخلیقی قوتیں اس وقت تک بیکار ہیں جب تک انہیں کام میں لانے کے لیے ایک قوت متحرکہ نہ موجود ہو اور جب تک ان میں ہم آہنگی اور یکجہتی نہ پائی جائے"

اگر روسو اس مرحلہ پر خدا کا نام لینے کی جرأت کر سکتا تو ہم اس کو ایک ایسے یقین کی منزل میں دیکھتے جہاں پیغمبرانِ عالم کے صادق پیروکار اب سے قبل نظر آچکے ہیں اور جو اپنے کیریکٹر اور توحید کی تعلیم سے مطلوبہ ہم آہنگی اور یکجہتی پیدا کر کے دنیا کے سامنے سرخرو ہو چکے ہیں

عالمگیر انسانی تنظیم اور انسان

درحقیقت ایک مسلمان یہ تصور نہیں کر سکتا کہ انسان، انسانی وحدت کی ضرورت کو ایک واقعی ضرورت تسلیم کرنے کے بعد توحید کے دائرہ سے کس طرح علیحدہ رہ سکتا ہے اور خدا کو زندگی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کر کے دین فطرت کے اقتدار سے کیسے انکار کر سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ توحید اپنی جگہ ایک مستقل اور وحید مقصد ہے لیکن یہ امر افسوسناک ضرور ہے کہ دنیا کی ایک بڑی آبادی اس وقت تک اس سے علیحدہ ہے اور فرزندانِ اسلام کو ابھی اس عقیدۂ عظیم کے لیے ساری دنیا کو فتح کرنے کا عزم کرنا ہے۔

ہم اس مرحلہ پر جب کبھی دنیا کی حالت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں رنج ضرور ہوتا ہے اور ہم دکھ کے ساتھ اس کو محسوس کرتے ہیں کہ دنیا کی اکثریت نے آج تک اسلام کے اجتماعی نظام اور نظریۂ اجتماع کو کیوں نہیں سمجھا۔ اور اس وقت تک کیوں ان نتائج سے آگاہی نہیں حاصل کی جو عقیدۂ توحید کی رو سے خدا کو ایک جاننے اور ایک ماننے سے پیدا ہوتے ہیں۔

سائنس داں ہمیں بتلاتے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ ہم ان کی باتوں کو صحیح سمجھتے ہیں اور یہ مانتے ہیں کہ ہماری نظر کا آسمان اور اس کے جملہ عناصر ایک نظامِ شمسی کے ماتحت ہیں یقین کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور انسان کا یقین اُس کو قبول کرتا ہے کہ کائنات کے اس نظام میں ایک سورج ہے، یہ سورج ایک کارفرما وجود رکھتا ہے۔ اس کے گرد متعدد سیارے، بہت سے تارے کئی چاند، ہماری زمین (جس میں دوارب انسان آباد ہیں) ہمارا چاند جو ہماری دنیا کو ٹھنڈی روشنی پہنچاتا ہے، اس طرح گھوم رہے ہیں جس طرح زندہ انسانوں کی ایک بڑی جماعت کسی خاص مقصد کا عشق دل میں لے کر ایک محور پر گردش کرتی ہے۔ کتنے تعجب کی بات ہے عقل و خرد سے محروم ان ہزارہا مادی عناصر کے لیے تو یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک واحد نظام کی گرفت میں ایک واحد تاجدار کے ماتحت ایک واحد سلطنت میں اپنے روزمرہ کے فرائض ادا کرسکتے ہیں اور یہ بات انسان کی عقل میں آجاتی ہے اور ایک مستقل "مذہب عقل" کی اساس بن جاتی ہے لیکن انسان جس نے خدائے واحد کی مہربانی سے شرف و ناموس کا اعلیٰ درجہ حاصل کرکے تفکر و تدبر کے مقام پر پہنچ کر امامت اقوام کا منصب حاصل کیا ہے اور جو عقل و دانش کی وجہ سے دلیل و برہان سے روشناس ہے جب اپنے لیے عالمگیر تنظیم کے اصول پر غور کرتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ اس دنیا کا ایک نظام ہے اور اس نظام کا مرکز ایک ایسے قادر اور واحد آمر کی ذات ہے جس کو قریب قریب تمام انسان کسی نہ کسی نوعیت سے مانتے ہیں تو یہ آسان اور عقل میں آنے والی بات انسانی عقل کی دسترس سے باہر ہوجاتی ہے۔

انسانی وحدت اور توحید کا انکار

انسان کی وحدت اگر ایک اچھا مقصد ہے تو یہ ظاہر ہے کہ اس کا بروئے کار آنا خود انسان ہی کے لیے مفید ہے اور اگر اسلام اس مقصد کی تکمیل کے لیے آگے بڑھ کر کام کرتا ہے تو

اس کا یہ اقدام انسان ہی کے فائدہ کے لیے ہے۔

اگر ہم اسلام کے مقابلہ میں انکار کی قوت کو کار فرما دیکھتے ہیں تو ہمیں تعجب ضرور ہوتا ہے یہ بات یقیناً رنج میں اضافہ کرتی ہے کہ انسان کی تاریخ قدیم، دور جدید کی طرح عقیدۂ توحید کی قطعی بالادستی اور عالمگیر حاکمیت سے خالی ہے۔ ہم انسانی تاریخ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں، کھول کر دیکھتے ہیں صفحے کے صفحے الٹتے ہیں اور ہر صفحہ کی ایک ایک سطر سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ انسان ماضی میں کیا تھا اور اس کا ماضی کیسا تھا۔ انسانی جمعیت کی شیرازہ بندی کس طرح ہوئی اور زمانہ قدیم کی سوسائٹی اپنے مختلف دوروں میں فسلفہ وخیال سے گذر کر عملاً کس حد تک عالمگیر وحدت کی طرف مائل ہوئی۔ اگر مائل تھی تو اس کے اس میلان کا مرکز اور اس رجحان کی بنیاد کونسا قانون تھا اور اس بنیاد میں کس قسم کا اصول کار فرما تھا؟

جب ہم تاریخ کے سامنے یہ سوال پیش کرتے ہیں تو ہمیں اس کا جواب، اُس جواب سے بالکل مختلف ملتا ہے جو اسلام پیش کرتا ہے۔ تاریخی زمانہ سے لے کر اور اس زمانہ تک تاریخ ہمیں جواب دیتی ہے اور علم وآگاہی کے دروازے ہمارے لیے کھول دیتی ہے۔ ہم تاریخ کے صفحات پر گزشتہ واقعات کو دیکھتے ہیں اور اس طرح دیکھتے ہیں کہ ہمیں یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ گویا ہم آج کے حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں ہمیں انسانیت کے پردہ پر ایک حقیقی روشنی کی جگہ بہت سی روشنیاں نظر نہیں آتیں بلکہ نور کے پردہ پر چند سیاہ تصویریں نظر آتی ہیں جن میں سے ہر تصویر الگ الگ ہے۔ ان میں سیاہی کی نمود جس قدر یکساں ہے، اسی قدر ہر تصویر اپنے مجموعی نقوش کے لحاظ سے مختلف ہے۔

بصیرت کی آنکھ دیکھنا نہیں چاہتی مگر مجبوراً دیکھتی ہے کہ انسان ایک خدا کی جگہ خدا کی مخلوق کو پوج رہا ہے کہیں انسان خدا ہے کہیں خدا کا بیٹا۔ کہیں پتھر پروردگار ہے تو کہیں پتھر

کی صورت معبود کہیں خدا کی جگہ دریاؤں کی ہے ہے تو کہیں پیپل کے پتوں کو دھنبا دے ہے کہیں خیر و شر کے محرکات میں خدا کی تلاش ہے اور یزدان و اہرمن کا مقابلہ ہے تو کہیں چاند دیوتا اور سورج مہادیوتا انسان کے سر عقیدت پر سوار ہیں۔

جس طرح توحید کا قدرتی نتیجہ دنیا کی تنظیم اور عالمگیر انسانی وحدت ہے اسی طرح توحید سے روگردانی کا بالکل قدرتی نتیجہ دنیا کے شیرازہ کی درہمی برہمی اور دنیا بھر کے انسانوں کی تقسیم و تفریق، واضح اختلاف اور کھلا ہوا انتشار ہے تاریخ اپنے ہر دور میں اس دعوی کی دلیل پیش کرتی ہے کہ توحید سے انسانیت کی توحید کا ظہور ہوتا ہے اور توحید کے عقیدۂ عظیم کا انکار کرنے سے انسان اپنے درجہ سے گر کر لا انتہا تقسیموں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے قدیم زمانہ میں انسان نے جب کبھی توحید کے اصول سے سرکشی کی تو ہم نے دیکھا کہ انسان مختلف قوموں ملتوں مذہبوں، مسلکوں، طبقوں اور سوسائٹیوں میں بٹا ہوا ہے۔ اگر کسی جگہ ہزار انسان ہیں تو ان کی سو جماعتیں بنی ہوئی ہیں۔ اگر بیس مذہب ہیں تو وہ ایک سو بیس فرقوں میں تقسیم ہیں۔ اور اگر پچاس فرقے ہیں تو ہزار طرح کے خیالوں کی وجہ سے باہم مختلف اور آپس میں ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔

انسانی زندگی کی تاریخ

انسان کی تخلیق اور انسانی زندگی کے مختلف زمانوں اور انسان کی عمر کے متعلق قدیم اور جدید نظریوں میں کافی اختلاف ہے، اس لیے صحیح طور پر اس بات کا تاریخی اندازہ پیش کرنا دشوار ہے کہ انسان کتنے ہزار سال قبل پیدا ہوا، اپنی پیدائش کے بعد مختلف دوروں میں کس کس طرح اجتماعی زندگی بسر کرتا رہا اور خدائے پاک کے متعلق ہر دور میں کس کس قسم کے خیالات پر قائم رہا۔ سائنس کی تحقیقات بھی اس خاص مرحلہ پر ہماری یقینی امداد سے قاصر ہیں۔ کیونکہ سائنس

تحقیق کے درجۂ کمال پر پہنچنے کے باوجود قدرت کے تاریخی تصرفات کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے اور قیاس کی منزل پر پہنچ کر بارہا اپنے عجز کا اعتراف کر چکا ہے۔ سائنس کے روز روز کے بدلتے ہوئے نظریے انسانی عقل کے ادعا پر اکثر ہنستے رہتے ہیں۔ نظریوں کا قائم ہونا اور ٹوٹنا مسلمات کا یقین بنکر سامنے آنا اور انکار کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جانا وہ امور ہیں جو قدرت کی بالادستی کو ثابت کر رہے ہیں اور اس کی وجہ سے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ کائنات کے عناصر پر قبضہ حاصل کرنے والے انسان کو خود اپنی صحیح تاریخ پر بھی دسترس حاصل نہیں ہے۔

نئے آثار کے کشف و اکتشاف کے باوجود ہمارے پاس کوئی دلیل ایسی نہیں جس کی بنا پر ہم یہ دعویٰ کر سکیں کہ انسانی زندگی اور تاریخ و تمدن کا آغاز موجودہ دنیا کے کس حصہ سے ہوا ہے۔ وہی لوگ جو کل تک طوفان نوح کے منکر تھے آج قرآن کی تائید کر رہے ہیں اور علم الارض کے پیمانے سے طوفان کی وسعت کو ناپ رہے ہیں۔ انسانی تمدن اور تنظیم کے آغاز میں آج بھی اختلاف ہے علمائے آثار اس باب میں مختلف الرائے ہیں۔

بطلیموس اور میلاد مسیح سے قبل کے علماء جغرافیہ انسان کی عمر سے بحث کرتے ہیں مگر ان میں اور ان کے بعد آنے والے علماء میں قیاس و تجربہ کے معاملہ میں واضح اختلاف ہے بطلیموس کے قیاس کی رو سے انسانی زندگی کو پینتیس ہزار سال ہوئے ہیں۔ ڈیوڈور۔ جو میلاد مسیح کے زمانہ کا یونانی مؤرخ ہے تینتیس ہزار سال کا عدد پیش کرتا ہے۔ کلدانی مؤرخ بیروز جو تین صدی قبل مسیح کے علماء میں سے ہے طوفانِ نوح سے ملکۂ بابل سمیرامیس تک ۳۶ ہزار سال کی مدت قرار دیتا ہے۔

دور جدید کے علماء قدیم نظریوں کے مقابلہ میں مختلف اسلوب سے اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔ ان کی رائے کا انحصار قیاس، علم، تجربہ، آثار اور آثار کی تحقیقات پر ہے وہ دیکھتے ہیں کہ انسان کی زندگی کے اجزا منتشر ہیں۔ ہمہ گیر اجتماعی نظام سے محروم اور مختلف صورتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بنی نوع

انسان ایک تخلیقی وحدت ہے مگر بعد کے تصرفات کی وجہ سے بُری طرح پراگندہ اور متفرق ہے اس وحدت کے اندر نسلوں کا اختلاف ہے۔ زبانوں کا اختلاف ہے رنگوں کا اختلاف اور جسم کے اعضاء اور نقش و نگار کا اختلاف نمایاں ہے۔ پھر جسم کے اختلاف میں لمبی اور چپٹی ناکیں مختلف قسم کے بال اور طرح طرح کی کھوپریاں آتی ہیں، جن کو چار ہزار سال قبل کے مصری آثار اور جدید تجربہ کی روشنی میں علیحدہ علیحدہ خصوصیات کے ساتھ دیکھا جاسکتا ہے۔

علماءِ عصر کہتے ہیں کہ انسانی زندگی کے اس اختلاف کے لیے بہت بڑی مدت درکار ہے جس کا احاطہ کرنا صرف علم و قیاس ہی سے ممکن ہے۔ انگلستان کی رائل اکاڈمی نے مسٹر آنر کو انسانی عمر کا پیمانہ بنانے کے لیے مقرر کیا تھا انہوں نے مصری آثار کی امداد سے کام لیا اور فیصلہ کیا کہ انسان کی عمر تیس ہزار سال ہے[1]۔ قدیم اور جدید علماء کے یہ نظریے عرصہ سے نظام عالم میں کارفرما ہیں انسانی عمر کی طرح انسانی اطوار کے تاریخی زمانوں کے متعلق بھی ان میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن یہ اختلاف ہمارے مقصد کے خلاف نہیں بلکہ معاون ہے۔ کیونکہ انسانی زندگی میں جس قدر اختلاف زیادہ نمایاں ہوگا اسی قدر اس کا ردعمل وحدت کی طرف ہوگا اور ہم توحید کے مقصد کو اسی قدر کامیابی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرسکینگے۔

اس مرحلہ پر ہمیں اگر بحث کرنی ہے تو صرف انسانی زندگی سے بحث کرنی ہے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ اسلام سے پہلے توحید کا عقیدہ کس قدر کمزور تھا اور توحید اقوام کا رشتہ کس طرح ہاتھ سے جاچکا تھا اور جب اسلام دنیا میں جہانگیری اور جہاں بانی کی عالمگیر قوتوں کو لے کر ظاہر ہوا تو اُس نے کروڑوں انسانوں کے اختلاف کو مٹا کر اُن کو کس طرح ایک کردیا۔ اس موقع پر ہمیں تاریخ کے اختلافات سے نہیں بلکہ صرف تاریخ سے بحث کرنی ہے۔

---

[1] دائرۃ المعارف فرید وجدی۔ ج ۲-۱۔ ص ۷۰۹۔

انسانی اختلاف کا پس منظر

قاضی ابوالقاسم صاعد بن احمد اندلسی نے جو پانچویں صدی کے اسلامی مورخوں میں سے ہیں اپنی کتاب طبقات الامم میں اقوام وامم کے عادات و اطوار پر تاریخی تصریحات پیش کی ہیں ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کا تاریخی پس منظر اختلاف اور مخالفت کے ادا کاروں کی اداکاری سے بھرا ہوا تھا۔ قاضی صاحب اسی اختلاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: (وَوَجدنا هٰذه الامم على كثرة فرقهم وتخالف مذاهبهم طبقتين فطبقة عنيت بالعلم وطبقة لم تعن بالعلم)

تاریخ قدیم کی یہ تمام قومیں جو مختلف فرقوں، مختلف طبقوں اور مختلف مذہبوں میں بٹی ہوئی ہیں دو بڑی شاخوں میں منقسم ہیں

(۱) ایک شاخ میں وہ قومیں ہیں جن میں قدامت کے ساتھ علم اور تمدن کے محرکات بھی کارفرما ہیں۔

(۲) دوسری شاخ ان قوموں پر مشتمل ہے جنہیں علم اور تمدن کو پورا پورا واسطہ نہیں رہا

پہلی شاخ میں ہندوستانی، فارسی، کلدانی، عبرانی، یونانی، رومی، مصری اور عربی اقوام شامل ہیں۔ دوسری شاخ میں چینی، یاجوج ماجوج، قدیم ترکمان، روسی، بربری، سوڈانی اور حبشی وغیرہ ہیں۔ دوسری شاخ کی اقوام کے متعلق قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ اگرچہ جغرافیائی حالات اور مولد ومدفن کے لحاظ سے ان اقوام کی حالت مختلف تھی لیکن بالعموم جہل، بلادت طبع، عصیان اور طغیان کے اعتبار سے اُن کے کوائف واحوال یکساں تھے۔ پہلی شاخ کی قومیں اپنے دور کی متمدن قومیں ہیں لیکن ان کی مذہبی زندگی توحید سے خالی نظر آتی ہے۔ ان اقوام کے اطوار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں شرک میں مبتلا، توحید کے اعتقادی مرکز سے دور اور انسانی وحدت کے ہمہ گیر تصور سے محروم تھیں۔

ہمارے مخصوص نقطۂ نگاہ سے تاریخ کے قدیم زمانہ میں اقوام کی اعتقادی حالت کیسی تھی اور انسان دنیا کے بعید ترین حصوں میں ایک خدا کے علاوہ خدا کی مخلوق، قدرتی مناظر، مادی عناصر بتوں، مجسموں، پتھروں اور اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی چیزوں کو کس طرح پوجتا تھا اور اُن کے سامنے کس قدر ذلت جہالت اور بے عقلی کے ساتھ سر خم کرتا تھا؟ ہم یہاں اس کی مختصر اور جامع تفصیل کرتے ہیں:۔

(۱) قدیم ہندوستانی | ہندوستانی اقوام زمانۂ قدیم میں کیسی کچھ تھیں اس کا حال ہمیں اس دور میں بجائے خود معلوم ہے۔ مندروں میں بتوں اور پیپل کی شاخوں کی پوجا۔ ہمالہ کے دامن میں گنگا کی پوجا، سڑکوں پر چلتی پھرتی گایوں کی پوجا، رامچندر جی، کرشن جی، ہنومان جی، مہابیر جی، شیو جی، مہادیو اور کالی دیوی کی پوجا۔ شودروں اور کم ذات کے لوگوں کا یہ عقیدہ کہ آسمان کے عناصر خدا کی طرح دنیا کی زندگی میں موثر ہیں۔ اور ان کی پوجا کرنی چاہیے۔

یہی اعتقادات ہیں جو اس زمانہ تک ہندوؤں کی پستی، پست خیالی اور تقسیم و تفریق کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں مشہور مستشرق ڈاکٹر لوتھراپ اسٹاڈرڈ منوجی کے ورن اشرم کے پست ترین تصورات پر بحث کرتے ہوئے انسانی زندگی کے انتشار پر آنسو بہاتے ہیں۔

"مذہب براہمہ (یعنی ہندو مذہب) غالباً سب سے زیادہ تنگ نظر اعتقادات کا مجموعہ ہے

تاریخی حصہ کے مأخذ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) علامہ فرید وجدی کی انسائیکلوپیڈیا (دائرۃ المعارف) جلد ۲۔۱۔ص ۷۰۹۔ (۲) طبقات الامم (قاضی ساعد اندلسی متوفی ۴۶۲ھ مطبوعہ مصر) (۳) فلسفہ عجم ڈاکٹر اقبال حصہ اول باب اول (The Development of Metaphysics in Persia) (۴) العقائد۔ استاذ عمر عنایت مصری

(۵) تاریخ ملل شیر محمد افغان کابلی (روسی زبان سے فارسی میں ترجمہ) (۶)

(۶) تاریخ ملل قدیمہ۔ موسیو سنوبیس فرانسیسی (ترجمہ انجمن ترقی اردو)

(۷) تاریخ ملل قدیمہ (مطبوعہ کابل) ہاشم شائق افغان نائب صدر علمی اکاڈمی افغانستان)

[1] دیکھو دھرم شاستر منو۔ اشلوک ۱۸۱ ادھیائے ۱۔

کیونکہ یہ مذہب انسانی سماج کو ایسی لاانتہا ذاتوں میں تقسیم کرتا ہے جن کے درمیان کوئی باہمی ربط ممکن نہیں[1]۔

کلدانی اقوام | آرمینیا کے بلند اور برفانی پہاڑوں سے دو بڑے دریا جنہیں دجلہ و فرات کہتے ہیں، یہ دونوں دو مخالف سمتوں میں بہہ کر آخر میں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں جو نشیبی اور وسیع علاقہ میں ان دونوں دریاؤں کا سنگم ہے جس کو آج کل عراق کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کلدہ کہتے تھے۔ یہی علاقہ کلدانی اقوام کا تاریخی مرکز تھا۔ تین ہزار سال پرانی اس تہذیب میں تمام ارتقاء کے باوجود کوئی اعتقادی وحدت نہیں تھی جب انسان ایک خدا سے بغاوت کرتا ہے تو اس کی گردن پر ہزار خداوند سوار ہو جاتے ہیں۔ موسیو سنوبس فرانسیسی لکھتے ہیں کہ کلدہ کے ہر شہر میں ایک خاص خداوند کی پرستش کی جاتی تھی[2]۔ بادشاہ ان خداوندوں کو اپنے سے بالاتر سمجھتے تھے۔ بابل کا حکمراں حمورابی کا ایک کتبہ دستیاب ہوا ہے جس میں لکھا ہے کہ میرے خداوند نے مجھ کو شومیر و اکد کے ملک کا فرمانروا کیا ہے۔ ایک اور بادشاہ تگلا فالازار خود کہتا ہے "خداوند آشور کے حکم سے میں نے جنگی گاڑیوں اور فوجوں کو جمع کیا"۔

کلدانی تمدن کی یہ تاریخ اختلاف سے معمور ہے۔ اس اختلاف کو خود شاہان کلدہ کی زبان میں سنیے:-

۱۔ "میں نے اپنے خداوند کے حکم سے شہر پر یورش کی۔ وہ تیر جو ایان نامی دیوتا برساتا ہے اولوں کی طرح برستے رہے"۔

۲۔ "میں نے نصف آدمیوں کو قتل کر ڈالا اور نصف کو غلام بنالیا، اور اپنے مخالف باغیوں کی کھالیں کھنچوالیں۔ ان کو دیوار میں چنوا دیا اور بہت سوں کے بدن میں لکڑی داخل کر دی"۔

کلدانیوں کی تفریق اور زبان کے اختلاف کا منظر بھی دیکھیے۔

"بابل کے باشندوں نے آسمان تک بلند برج بنانے کی جسارت کی خداوند کو اس پر غصہ آیا اور انہوں نے ان کی زبان میں اختلاف پیدا کر دیا۔ وہ ایک دوسرے کی بات سمجھنے سے محروم ہو گئے اس لیے تمام دنیا میں پراگندہ اور منتشر ہو گئے۔"

مصری اقوام قدیم مصری اقوام میں فرعون کا نعرہ "اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی" اور اس کے پرستاروں کی ایک جماعت کا وجود قرآن شریف سے ثابت ہے۔ فرعون غرق ہو گیا، اور اس کا غرق ہونا یقیناً مذہب توحید کی فتح تھی۔ مگر تاریخ نگار لکھتے ہیں کہ قدیم مصری اقوام نے مُردوں کی پرستش شروع کر دی۔ ان مُردوں کا ایک دیوتا تھا جس کے نام سے ہر معبد میں پتھر کی ایک سل پر یہ عبارت لکھ کر رکھی جاتی تھی:-

"ہم اموات کے خداوند ازریس کو سجدہ کرتے ہیں کہ وہ کھانا جن کو وہ خود استعمال کرتا ہے مردے کی روح کو بھی عطا کرے۔"

انسانی عقل کی گمراہی کا یہ منظر جس کے ساتھ قدیم تمدن کی تائید بھی ہے کس قدر دردناک تھا، اس کو اس زمانہ کے وہ انسان جو قبرستان سے وحشت کھاتے ہیں، اور مرگھٹ تک جاتے ہوئے خوف سے مرے جاتے ہیں بخوبی محسوس کر سکتے ہیں۔

فینیقی اقوام موسیو سنوبیس لکھتے ہیں: "قدیم فینیقی پتھروں اور درختوں کو خدا کا درجہ دیتے تھے اور بعض پتھروں کو خدائی درجہ دے کر انہیں بیت ایل (خدا کا گھر) کہتے تھے۔ ان پتھروں کی عظمت اس سے ظاہر ہے کہ وہ انڈے یا گاجر کے برابر ہوتے تھے۔"

فینیقی حضرت عیسیٰؑ سے سولہ صدی قبل لبنان اور سمندر کے درمیانی قطعہ میں رہتے تھے۔

بابل فارس فارس کے قدیم باشندوں کا وطن حلوان کے قلۂ کوہ سے عراق کے شمال میں پہاڑوں سے شروع ہوتا تھا۔ ماہان، کرخ، دینور، ہمدان، قم، کاشان کے منطقوں سے بلاد آرمینیہ تک اور بحر آذربائیجان سے بلاد خراسان، مرو، ہرات اور بلاد سجستان تک ان کا علاقہ تھا۔

تاریخ قدیم کے علماء یہ تصریح کرتے ہیں کہ اہل فارس موحد تھے اور وہ یوذاسف کے دور سے ظہور رس (تیسرے ایرانی بادشاہ) تک توحید پر قائم رہے اور اس شان کے ساتھ کہ ان کا ملک متحد تھا، ان کی سلطنت منظم تھی اور ان کی زبان بھی ایک تھی، مگر آخر کار انہوں نے توحید کے عقیدہ سے روگردانی کی اور مجوسی ہو گئے اور آگ کو پوجنے لگے۔ تاریخ کا بیان ہے اور اس کی صحت کے لیے تاریخ ہی ذمہ دار ہے کہ گشتاسپ (شاہ ایران) کے زمانہ میں مصلح کی حیثیت سے زرتشت کا ظہور ہوا جس نے آتش پرستی کی دعوت دی اور قوم نے اس دعوت کو قبول کر لیا۔

مجوسی اعتقاد کے پانچ ارکان تھے۔ (۱) باری تعالیٰ (جیسا کہ مجوسیوں کا تصور تھا) (۲) شیطان (۳) ہیولی (۴) زمان (۵) اور مکان۔ مجوسیت کا کلمہ آتشیں یہ تھا کہ دنیا نور اور تاریکی، روشنی اور ظلمت کا مجموعہ ہے۔ چنانچہ ایرانی لوگ توحید اسلام کے ظہور سے قبل تیرہ سو سال تک اسی مجوسی کلمہ پر قائم رہے۔

زرتشت سے قبل ایران دو حصوں میں منقسم تھا، ایک حصہ خیر کو فاعل مختار مانتا تھا دوسرا بدی کو، ایک بھلائی کے معبود کو پوجتا تھا دوسرا شیطان کو اور شیطانی قوتوں کو۔ درحقیقت قدیم ایرانیوں کی یہ پیکار دو قدیم طبقوں کے نزاع کا نتیجہ تھا۔ جو علامہ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کی تصریح کے مطابق اولاً ایک دوسرے کے ارباب (دیوتاؤں) دیوا اور اہورا کی تحقیر کی صورت میں نمودار ہوا۔ درحقیقت یہ تفرق کا ایک عمل تھا جس نے عقیدہ کے اختلاف کے ساتھ ایک ایرانی شاخ کو دوسرے آریائی قبائل سے علیحدہ کر دیا اور بالآخر یہی اختلاف زرتشت کے نظام میں رونما ہوا۔ درحقیقت یہ نزاع عقیدۂ توحید سے علیحدہ ہونے کا قدرتی نتیجہ تھا کیونکہ اعتقاد اور فکری اختلاف کا اثر لازماً انسان کی اجتماعی زندگی پر پڑتا رہتا ہے، جو ایران میں پڑ کر رہا۔

زرتشت بدی کے وجود اور خدا کی نیکی میں مطابقت پیدا کرنا چاہتا تھا اس کے اسلاف نے

کثیر التعداد ارواح صالحہ کی پرستش کی تھی جن کی کثرت کو اُنہوں نے ایک وحدت میں تبدیل کرکے اس کا نام اہورا رکھا تھا۔ اور دوسری طرف شر کی تمام قوتوں کو یکجا قرار دے کر درج اہرمن اس کا نام رکھا۔ اس عمل توحید کے ذریعہ سے وہ دو اساسی اصولوں تک پہنچا۔ اسی بنا پر ڈاکٹر ہاگ کہتا ہے کہ ایرانِ قدیم کا پیغمبر (؟) دنیاوی نقطۂ نظر سے موحد اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے ثنویہ (یعنی دو قوتوں کو ماننے والا) تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ اس تصور نے ایرانی قوم کو ٹکڑے ٹکڑے اور توحید کے عقیدۂ عظیم کی روح کو پامال کردیا۔ اس نے دینی توحید اور فلسفیانہ ثنویت (ایک سے زائد قوتوں پر ایمان لانا) دونوں میں مطابقت پیدا کرنے کی جو کوشش کی اُس میں ایک خلقی کمزوری صاف نظر آتی ہے[1]۔ انسانی گمراہی کا یہ منظر کس قدر افسوسناک ہے کہ ایران میں زمین و آسمان کے نور حقیقی اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی جگہ نور کے مادّی عناصر کی پوجا شروع ہوگئی۔ مجوسی روشنی کے پوجاری تھے اس لیے ہر نوری شے کو پوجتے تھے۔ آگ چونکہ نور کا سب سے زیادہ بھڑکتا ہوا شعلہ ہے۔ اس لیے اسی درجہ میں اس کو اہمیت حاصل ہوگئی۔

ایرانی تیرہ سو سال تک آتش پرستی کی شریعت پر قائم رہے یہاں تک کہ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمانؓ نے فارس کی سلطنت کا خاتمہ کردیا اور اس کو اسلام کی مجلس اقوام کا ایک رکن بنادیا[2]۔

---

[1] فلسفۂ عجم ڈاکٹر اقبال، حصہ اوّل، باب اول۔
[2] طبقات الامم صفحہ ۲۲۔